

منیر رپورٹ سے منیر رپورٹ تک

(رٹیا ٹرڈ جسٹس منیر صاحب کی تازہ کتاب پر ایک نظر)

جناب نعیم صدیقی صاحب

یہ سمجھ کر کہ یہ کتاب ۱۹۷۹ء کی ایک اہم کتاب ہوگی، میں نے اپنے مصروف اوقات میں خاص طور سے گنجائش نکالی کہ اسے بغور پڑھوں۔ میرا اشارہ ہے، رٹیا ٹرڈ فاضل جسٹس منیر صاحب کی کتاب "فرام جناح ٹو صلیا" کی طرف۔ مجھے افسوس ہوا کہ دس ڈالر کی اس چھوٹی سی کتاب میں کوئی نیا مواد نہیں بلکہ وہی کچھ ہے جسے منیر رپورٹ میں پڑھ چکا تھا۔ منیر رپورٹ جس دور سے متعلق تھی اس کی گزرا گری سے گزر کر جب میں نے اس پر غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ فاضل مرتب کا کچھ ذہنی کامپلیکس ہے جس نے لفظوں، لکیروں اور نقطوں کی شکل میں ایک عنکبوتی جائے کیسیت اختیار کر لی ہے۔ رپورٹ کے صفحات پر عنکبوتی جالا اس طرح پھیل ہوا ہے کہ تحقیقاتی عدالت کے قیام کا اصل منشا غت رבוד ہو گیا ہے۔ ہاں ایک فوقیت یافتہ شخص کو جو اتفاق سے اضطرابات پنجاب کی تحقیقاتی عدالت کا صدر بھی تھا، کا روایتی پر حاوی بھی رہا، اور جس نے نتائج تحقیقات کی رپورٹ بھی مرتب کی، اس نے کچھ ذہنی آسودگی ضرور حاصل کر لی۔ یہ رائے میں نے اس وجہ سے قائم کی ہے کہ جس دور سے اس رپورٹ میں سیکولر ازم کی تبلیغ کی گئی ہے اور پڑھنے والے کے ذہن پر اسے ٹھونسنے کا اہتمام کیا گیا ہے، نیز جس بڑی طرح اسلام کو چوکے لگانے کے لیے علماء کو نشاۃ تحقیق و متحر بنایا گیا ہے۔ یہی ایک طرف انتہا پسندانہ رنگ کسی بڑے ذہنی رد عمل کا سراغ دیتا ہے۔ اس ذہنی رد عمل نے ساری بحث و گفتگو کو توازن سے محروم کر دیا ہے۔ یہی نہیں، اس میں حقیقی

شائستگی اور پابندی آداب ملحوظ نہیں ہے جو سنجیدہ سطح پر عملی — خاص طور پر دینی — موضوعات پر اختلافی گفتگوؤں میں شرفاء کا شعار ہے۔ یہاں توصاف طور پر جناب متکلم اپنے حق میں نہ صرف دعوائے علم رکھتے ہیں۔ بلکہ کسی قدر کبرِ علم — علم بھی محض دنیوی یا قانونی امور تک محدود نہیں، بلکہ دین و شریعت کا علم بھی شاملِ دعویٰ ہے۔ ادھر دوسرے فریق کی کوتاہی علم اور اس کی کم فہمی کا تذکرہ بھی ہے اور ساتھ ہی تضیک بھی خصوصاً یہ امر قابلِ غور ہے کہ تحقیقاتی عدالت کا صحیح طور پر ایک غیر جانب دار جج نہیں رہتا، بلکہ وہ خود فریق بن جاتا ہے۔

میں بزرگ فاضل جسٹس منیر صاحب کے احترام واجب میں ذرا سا فرق لائے بغیر یہ کہتا ہوں کہ ردِ عمل سے پیدا ہونے والی انتہا پسندی کا زہر قومی مسائل کا تجزیہ کرنے والی لیبارٹری کے تمام کیمیاویات میں حل ہو گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس رپورٹ کے اندر قومی بلکہ دینی مسائل زہر آلود ہو کر سامنے آئے ہیں۔ کیا قوم کے روپے اور صد ہا افراد کے وقت کا ایسا استعمال معقول تھا؟ دس ڈالر کی لاگت کی یہ کتاب درحقیقت اس حادثے کا نوحہ ہے کہ منیر رپورٹ مرچکی ہے — اور وہ تو جنم لینے کے ساتھ ہی مرچکی تھی۔

انسان کے لیے یہ تجزیہ بہت دردناک ہوتا ہے کہ اس کی فکری یا اعتقادی ہستی اس کے سامنے موت کے گھاٹ اُتر جائے۔ یہ تو جسٹس منیر کی ہمت ہے اور ہمیں اس کی داد دینی چاہیے کہ وہ خاموشی کا ایک لمبا وقفہ گزار کر جب موقع پاتے ہیں، منیر رپورٹ کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں اور سیکولر ازم کا وعظ سنانے لگتے ہیں حتیٰ کہ اگر ان کی بات کو کوئی نہ سُن رہا ہو، کہیں اُتر نہ پڑ رہا ہو، کسی کے دماغ میں تبدیلی نہ آ رہی ہو، تب بھی وہ منیر رپورٹ کی باتیں کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ ہی کو مخاطب بنا لیتے ہیں — بات سیکولر ازم کی سہی۔ مگر استقامت و استواری کی اپنی جگہ بڑی قدر و قیمت ہے۔ اس تکرارِ کلام کا ایک مقصد اپنے آپ کو اپنی مرجانے والی فکر کے زندہ ہونے کا یقین دلانا بھی ہے۔

فاضل جسٹس منیر نے اپنی تازہ کتاب میں پوری منیر رپورٹ کا خلاصہ دوہرا دیا ہے، اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی رپورٹ کا ذکر کر کے خوش ہوتے ہیں اور مزہ لیتے ہیں، بلکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی نفسیاتی تجزیہ کار ان کی تخریب میں ”نگسیت“ کا سراغ لگائے۔

منیر رپورٹ کی شانِ عالی | لیجیے آپ رپورٹ کے متعلق جسٹس صاحب کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے

کیونکہ داناؤں کا نظریہ پیشہ ور ہے کہ تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں۔ جس صاحب کی نیک بیانی
در تلخیص کردہ کی ایک جھلک :-

یہ بڑی لمبی تحقیقات تھی، مگر ایک خوشگوار اور دلچسپ کام تھا۔ یکم مئی
۱۹۵۲ء کو آغاز ہوا اور ۱۰ اپریل ۱۹۵۴ء کو رپورٹ داخل کر دی گئی۔ اس میں ۱۶۰۰ صفحات
پر مشتمل تحریریں بیانات شامل ہیں۔ ۲۶۰۰ صفحات شہادتوں کے ہیں۔ ۳۳۹ دستاویزات
لی گئی ہیں۔ ۱۰۰ صفحات خطوط کے لیے وقف ہیں۔ بے شمار کتابیں، پمفلٹ، رسائل اور
اخبارات شامل ہیں۔ عدالتی تحقیقات کی اصل رپورٹ ۳۸۷ مطبوعہ صفحات پر حاوی
ہے۔

اس رپورٹ کے بعد پاکستان کے متعلق جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں سے اکثر
میں اس رپورٹ کے حوالے ملیں گے۔

بیشتر پاکستانی اخبارات نے اس پر زور دار تبصرے کئے۔ بعض نے سرخیوں
میں اسے "ایک عظیم دستاویز" (A GREAT DOCUMENT) اور "ایک
تاریخی دستاویز" (A HISTORICAL DOCUMENT) قرار دیا۔ انگلستان
اور آسٹریلیا میں بھی جرائد نے تبصرے کیے۔

پروفیسر حقی نے تاثراتی خط لکھا اور ملاقات میں کہا کہ میں پاکستان سے ایسی کسی
چیز کے منور ہونے کی توقع کر رہا تھا۔

کینیڈا کے ایک پروفیسر نے لکھا کہ میں نے اپنے طلبہ کے لیے موسمِ گرام کے مطالعاتی
پروگرام میں اس رپورٹ کو شامل کیا ہے۔ (ص ۴۱-۴۲)

رپورٹ اور شاہ ایران | سب سے زیادہ قابل توجہ شاہ ایران کی دلچسپی کا ذکر اور اس کے ساتھ
منیر صاحب کا دردمندانہ تاثر ہے۔ منیر صاحب بتاتے ہیں۔

شاہ ایران نے مجھ سے رپورٹ کے متعلق پوچھا تو میں نے بتایا کہ اس میں کیا کیا ہے
اس پر انہوں نے فرمایا کہ ایسے ہی مسائل ان کے یہاں بھی درپیش ہیں۔

یہاں بڑے حسرت و حرمیاں کے ساتھ جسٹس منیر فرماتے ہیں کہ:

آج ایران میں خمینی کے ہتھیوں انقلاب آچکا ہے۔ اسلامی ری پبلک کا قیام عمل میں آ رہا ہے۔ شاہ اور ملکہ میکسیکو (MEXICO) میں پناہ گزین ہیں (نوٹ: کتاب کی اشاعت کے بعد شاہ کے تارے نے اور بھی گریشیں مکمل کر لی ہیں) اور بہت سے نرجس میں شاہ کی حمایت کا سودا تھا، قلم ہو چکے ہیں۔ (ص - ۲۲)

ان کلمات حسرت و حرمیاں کو پڑھ کر یہی خیال آتا ہے کہ شاہ (اور ملکہ) کی تقدیر اگر اچھی ہوتی تو وہ پاکستان سے جسٹس منیر صاحب کو بلواتے اور اپنے ماں ایک تحقیقاتی عدالت لگوا کر تمام علماء اور مجتہدین کو اس میں پیش کر دیتے۔ پھر منیر صاحب ان کو طنز و تضحیک کا نشانہ بناتے اور خود اسلام کے قلب و جگر میں سیکولر ازم کے نشتر سے عمل جراحی کرتے کے بعد ایک ایرانی منیر رپورٹ مرتب کرتے۔ پھر خمینی کی بات کوئی سنتا، نہ دوسرے علماء کی دال گلتی، نہ شاہ اور ملکہ کو تخت اور وطن چھوٹنا پڑتا اور نہ کسی شاہ پرست کا سر قلم ہوتا۔ امن چین کی شاہی چلتی رہتی۔

گویا منیر صاحب کے پاس روایتی جتنا کہانیوں کا کوئی اسیم اعظم تھا جس کے طلسماتی عمل سے سیاسی مذہب کو روکا جاسکتا تھا اور تاریخ کے دھارے کا منہ موڑا جاسکتا تھا۔ کون منیر صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنے کی گستاخانہ جسارت کر سکتا ہے کہ دنیا کی تاریخ تحقیقاتی عدالتوں کی رپورٹوں سے نہیں بنتی، جن کے مرتبین کا کمرہ عدالت سے باہر عوامی سیاست کے دائرے میں کوئی مقام نہیں ہوتا، اور جن کا سارا احترام قانونِ انسداد توہینِ عدالت کے بل پر قائم ہوتا ہے۔ تاریخ کو تبدیل کرنے والے عوامل کا تعین اس واقعہ کی توجیہ سے ہو سکتا ہے کہ مکہ کے دارالندوہ کے عالیشان ایوان میں جو سردارانِ قریش عبا و قبا کے ساتھ کثیر تعداد میں مشورے کیا کرتے تھے، ان کو ایک غریبانہ سے خانہ ارقم میں سر چھپانے والے فقیروں کے فکر و فکر نے کس طرح زک دے دی۔

خیر جسٹس منیر صاحب کو ہم کیوں مجبور کریں کہ وہ سیکولر ازم کی بے جان میت کو الگ رکھ کر

نہ جسٹس منیر صاحب کا زعم یہی ہے کہ اس رپورٹ میں ایسا طلسمی اثر موجود ہے۔

تاریخ پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا کھوج لگائیں۔ البتہ اُن سے ہم یہ ضرور پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کی نظر میں آیت اللہ خمینی کی اسلامی ری پبلک کتنی بھی بُری ہو، آخر اُس نے ریفرنڈم کرایا ہے۔ دستور تیار کرایا ہے۔ انتخابات کرائے ہیں۔ اس کے بالمقابل آپ میں شاہ پرستی کیوں رہے؟ آپ کو علامہ خمینی سے یہ توقع کیوں تھی کہ وہ شاہ کے نظامِ ظلم کے اُن آلہ کاسے کار کی بددقوں اور تلواروں کو چومتے جنہوں نے حالیہ انقلاب میں کئی ہزار سروں کی فصل کاٹی اور جنہوں نے شاہ کے دور میں سیاسی اور دینی حلقوں سے صدائے اختلاف اُٹھانے والے ہر آدمی کا صفایا کر دیا۔ یہاں تک کہ شاہ کے تخت کے پائے ہمیشہ ایران کے بے گناہ مسلمانوں کے خون میں ڈوبے رہے۔ شاہ کیسے بھی خانہ بانداز چین بنا رہا ہو اور اُس کے ان گنت گشتگانِ ناز کے لاشے چپے چپے پر تڑپتے رہے ہوں۔ اُن کے خیال سے تو جسٹس صاحب کے کانوں پر جوں تک کبھی نہ رینگے، مگر اب خمدنخوار بادشاہت کے چہیتے قاتلانِ عوام کی نسبت بہت کم تعداد کو کیفر کردار تک پہنچانا آنجناب کو سخت ناگوار گذر رہا ہے۔

یہ فرق شاید اس لیے کہ شاہ بہر حال سیکولرسٹ ہونے کے لحاظ سے جسٹس منبر صاحب کا ہم مشرب مختار۔ اور کوئی سیکولرسٹ اگر کشتوں کے پشتے بھی لگا دے تو برحق۔ مگر آیت اللہ خمینی چونکہ اسلامی انقلاب لا کر اسلامی ری پبلک قائم کرنے کا جرم کر چکے ہیں۔ لہذا اُن کے دور میں کسی بدترین خونریز کی نکیر بھی پھوٹے تو مقامِ ماتم واضطرار ہے۔

رپورٹ کا کراماتی اثر | اب جسٹس صاحب کا ایک اور دلچسپ نکتہ اپنی رپورٹ کی شان میں منیے۔ ارشاد کی تلخیص یہ ہے:

انکو اٹری کیٹی کی رپورٹ حکومت کو پیش کرنے کے بعد اسلامی ریاست کا مطالبہ سرد پڑ گیا۔ علماء پس منظر میں دھکیل دیے گئے۔ پھر کوئی آواز ۶۲ء سے پہلے نہ اُٹھی۔ جب کہ جماعت اسلامی کے ایک آدمی نے کابینہ میں اسلام کو نظرِ پاکستان قرار دیا۔ (۷۱۱۱)

لے یہ غالباً ذکر ہے مشرقی پاکستان کے مرحوم بیسٹرا اختر الدین صاحب کا جو ایوب صاحب کی کابینہ میں تھے، مگر اُس وقت وہ جماعت اسلامی کی نمائندگی کی پوزیشن میں نہ تھے۔

یہاں واشگاف طور پر منیر صاحب نے اپنی رپورٹ کی "کرامات" بیان فرمادی ہیں اور اس مقام پر ایک دبا دبا سا اظہارِ فخر و مباهات محسوس ہوتا ہے۔

مگر کیا حالات کے متعلق یہ واقعی اور صحیح بیان (STATEMENT) ہے ؟

بطور خلاصہ اس وقت کا نقشہ احوال پیش کرتے ہوئے میں یہ اشارہ ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی دستور سازی میں سب سے بڑی حائل قوت سیکولر، آزاد منش مغرب پسند طبقے کی تھی جس نے ہر مرحلے پر تاخیر بے جا سے کام لیا۔ اور ہر بار دودھ میں بیگنیاں ڈالنے کی کوشش کی۔ اس کشمکش کی وجہ سے دستور سازی کا پہلا اقدام قرار داد مقاصد پاس کرنے کی صورت میں مارچ ۱۹۴۹ء میں ہوا۔ ڈیڑھ سال بعد ستمبر ۱۹۵۰ء میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی پہلی رپورٹ سامنے آئی۔ یہ نہ صرف قرار داد مقاصد سے کھد تضاور کھتی تھی بلکہ مختلف اداروں، جماعتوں، اخبارات اور علما نے اسے "کتاب سنت کے ساتھ نہایت"۔ "اسلام کے نام پر سنٹ"۔ "دینی تصور میں تحریف"۔ "اسلام اور جمہوریت دونوں کو چکے"۔ "شہری آزادی کا خون"۔ "۱۹۳۵ء کے ایکٹ سے بدتر"۔ قرار دیا گیا اور مطالبہ اٹھا کہ اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ اور یہی حشر اس کا ہوا۔ پھر اٹھارہ ماہ تک فضا ٹھنڈی رہی۔ (یہ تحقیقاتی عدالت سے پہلے کی بات ہے)۔ اس سناٹے کو پھر مولینا مودودی مغفور نے توڑا۔ اور مئی ۱۹۵۲ء تک مطالبہ دستور اسلامی کی تحریک کی دوسری لہر اٹھا دی۔ ۸ نکاتی دستوری مطالبہ سامنے لا کر تقاضا کیا گیا کہ ۱۹۵۲ء کے خاتمے تک دستور بنایا جائے۔ ملک بھر میں مدوجذر پیدا ہو گیا اور خواجہ ناظم الدین نے جو وزیر اعظم تھے، بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی دوسری رپورٹ دسمبر ۱۹۵۲ء میں پیش کر دی۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں تمام گروہوں کے علما نے اس میں متفقہ ترمیم پیش کر دیں۔ اور علما کا یہ اتفاق ۱۹۵۱ء کے بعد دوسری بڑی تاریخی مثال ہے۔ یہی ۱۹۵۳ء کا تھا جب کہ اسطر بات پنجاب کا ظہور ہوا۔ اور مولینا مودودی اور ان کے بہت سے رفقاء جماعت گرفتار کر لیے گئے خواجہ ناظم الدین کی وزارت ختم ہو گئی۔ پھر یکایک محمد علی بوگرا مسند حکومت پر آ گئے۔ غلام محمد کے زیر سایہ محمد علی بوگرا

سہ رائے عام کا تفصیلی ریکارڈ "دستوری سفارشات اور ان پر تبصرہ" کے زیر عنوان جمع شدہ ہے اور یہ کتاب شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی پاکستان نے شائع کی تھی۔

نے ایک ”عموری دستور“ کا شوشہ کھڑا کیا، مگر عوامی فضا ایسی تھی اور اسے مؤثر رکھنے کے لیے رابطہ عام اور اشاعتی ذرائع سے کام کرنے والے اتنا کام کر رہے تھے کہ شوشہ چل نہ سکا۔ اگر یہ خیال کا دور ہوتا تو سیکولر دستور بن کر چل جاتا۔ بوگرا صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ ۱۹۵۲ء کے آخر تک دستور پیش کر دیں گے اور ۱۹۵۲ء ہی وہ بدقسمت سال تھا کہ دستور ساز اسمبلی توڑ دی گئی۔ اور خوف و دہشت کی تاریکیاں پھیلادی گئیں۔ مقصد یہ تھا کہ مغرب پرست اکابر اپنی مرضی کا دستور بنا سکیں۔ مگر ۱۹۵۵ء میں جب نئی دستور ساز اسمبلی آگئی اور اس نے کام شروع کر دیا تو اسلامی دستور کا مطالبہ پھر زور پکڑ گیا۔ اسی سال مولینا مودودی معذور رہا ہو گئے اور انہوں نے اسلامی دستور کے لیے پھر عوامی تحریک کی سلسلہ جنیانی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ کہ ۱۹۵۶ء کا دستور مرتب ہوا اور چوہدری محمد علی کی سربراہی میں نافذ ہوا۔ اب اس دستور کے تحت ہونے والے انتخابات کو ۱۲ سال تک مؤخر کیا گیا۔ اور اس درمیانی وقفے میں محلاتی سازشوں کا خوب زور رہا اور پھر اس دستور سے جان چھڑانے کے لیے سکندر مرزا نے سرے سے جمہوریت ہی کو ایسی ٹھوکر لگائی کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ صرف مارشل لا رہ گیا۔ (غالباً یہ تھی منیر پورٹ کی اصل کرامات)۔

اس لمبی کہانی کو بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ منیر صاحب اور ان کے ہم خیالوں کو یاد دلایا جائے کہ نہ صرف یہ کہ منیر پورٹ کے آنے سے تحریک اسلامی دستور میں کوئی خلا واقع نہیں ہوا۔ بلکہ تشکیل پاکستان سے لے کر اب تک اسلامی عوامل اپنا کام کر رہے ہیں۔

بات کو آگے لے چلنے سے پہلے میں بڑے ادب سے یہ کہوں گا کہ کوئی بیج چاہے وہ ریٹائر نہ ہوا ہو، یہ استحقاق نہیں رکھتا کہ وہ تاریخ کو جس طرح چاہے تصنیف کر دے۔ تاریخ کسی تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ نہیں ہے کہ لکھنے والا جو رنگ بھرنے چاہے اس میں بھر دے۔ (باقی)

۱۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ مشرقی پاکستان میں جگتو فرٹ اور مغربی پاکستان میں ری پبلکن پارٹی کا ظہور ہوا جس کے متعلق بڑی خوشی کے ساتھ جلس صاحب فرماتے ہیں کہ دونوں کے منشوروں میں اسلام یا قرآن یا سنت کا کوئی ذکر نہ تھا۔^(۲۷۱) یعنی سیکولر جماعتیں نہیں (۱۷۱۱) مگر یہ مصنوعی جماعتیں کتنی پادری ہوا ثابت ہوئیں۔

۲۔ اگر ضرورت ہو تو منیر صاحب کی خدمت میں ایسی بہت سی تقریروں اور خبریوں کا ریکارڈ پیش کیا جاسکتا ہے جو عین اس زمانے میں کی گئیں جس کے متعلق وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا تذکرہ ختم ہو گیا۔ اور علماء گمنامی کے اندھیرے میں ڈوب گئے۔ ۶۲ء کے ایجنڈے میں آخر اسلامی ریاست کی اصطلاح کہاں سے آگئی؟